ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

محمد عبداللہ قریشی

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ہمارے قرب و جوار کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام تو بچپن ہی سے کانوں میں پڑ رہا تھا، ان کو دور دور سے دیکھنے کے مواقع بھی اکثر ملتے رہتے تھے، کبھی مشاعروں میں، کبھی ادبی مجلسوں میں، مگر ان سے براہ راست تعارف کی سعادت اسی وقت میسر آئی جب ۱۹۴۳ میں حکومت کشمیر نے ان کی خدمات حضور نظام دکن سے سر امر سنگھ ڈگری کالج کے پرنسپل کے عہدے کے لئے مستعار لے لیں۔ میں چونکہ ہر سال کشمیر جایا کرتا اور وہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ خلیفہ صاحب سے ملاقات نہ ہو۔ ملاقات ہوئی اور پہلے دن جس خلوص اور خندہ پیشانی سے پیش آئے آخر دم تک اسی طرح ملتے رہے۔ میری کم علمی اور اپنی فضیلت کا احساس انہوں نے کبھی نہیں ہونے دیا۔ میں نے ان کی صدارت میں کئی مقالے سرینگر میں پڑھے اور ان کے وسیع ذخیرۂ معلومات سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا۔

خلیفہ صاحب سے سب سے طویل ملاقات ۱۹۴۶ کی سردیوں میں جموں میں ہوئی جب وہ ترقی کرکے سر رشتۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر ہوچکے تھے۔ تقریب یوں پیدا ہوئی کہ منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور، جو کشمیر کے متعلق متعدد کتابیں لکھ چکے تھے (جن میں تاریخ کشمیر، مشاہیر کشمیر، رہنمائے کشمیر، خواتین کشمیر، شباب کشمیر، حکایات کشمیر، کشمیر کی رانیاں، تاریخ ہڈ شاہی، تاریخ اقوام پونچھ اور تاریخ اقوام کشمیر بہت مشہور ہیں) اپنی تصنیف تاریخ اقوام کشمیر کی تیسری جلد مرتب کر رہے تھے کہ ۴ ستمبر ۱۹۴۵ کو انہیں بلاوا آگیا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس نامکمل جلد کی تکمیل میرے سپرد ہوئی اور میں نے ایک سال کی لگاتار محنت سے یہ کتاب مکمل کرکے مرحوم کی پہلی برسی کے موقعہ پر ۴ ستمبر ۱۹۴۶ کو شائع کردی۔

اس کتاب میں کشمیری مسلمانوں، کشمیری پنڈتوں اور دوسرے خاندانوں کے علاوہ جو کشمیر میں رہتے تھے، ان کشمیری خاندانوں کا ذکر بھی ہے جو کشمیر سے نقل مکانی کرکے دوسری جگہ آباد ہوگئے تھے۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ کشمیر کی مختلف قوموں نے ملک کی سیاسی، مذہبی، تمدنی، معاشری، علمی اور اقتصادی زندگی میں کیا انقلابات پیدا کئے اور اس میں ہر نسل اور قوم کا کتنا حصہ ہے۔

اس سلسلے میں مجھے ڈار خاندان کی شاخ لاہور اور سرینگر کا ذکر بھی کرنا تھا ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم چونکہ اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ضروری معلومات حاصل کیں ۔ باتوں باتوں میں کئی دیگر مسائل بھی زیر بحث آئے، لطیفے بھی ہوئے اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت ہی وسیع المعلومات شخصیت تھے، ذہن رسا تھا اور علم مستحضر، بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ جاتے اور کوئی نہ کوئی نیا نکتہ نکال لاتے تھے ۔ ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔ مشکل سے مشکل مسئلے پر بھی سادہ الفاظ میں اس شان سے گفتگو کرتے تھے کہ مخاطب قائل ہوجاتا تھا ۔

ذیل کی سطور اسی ملاقات کی یادگار ہیں ۔ میں نے سیدھے سبھاؤ ان کے حالات لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے ، ان پھول جھڑیوں کو چھوڑ دیا ہے جو قدم قدم پر چھوٹتی رہیں ۔

خلیفہ عبدالحکیم ۱۲ جولائی ۱۸۹۳ کو لاہور میں پیدا ہوئے ۔ طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ اس کے باوجود اپنے ہم جماعتوں میں ہمیشہ اول رہتے تھے ۔ ۱۹۱۰ میں اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازہ سے انٹرنس کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا ۔ اسی زمانے میں آپ کی پہلی نظم کشمیری میگزین لاہور میں شائع ہوئی ۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے جہاں ایف ۔ اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور فی البدیہ تقریری مقابلوں میں اول آکر انعام بھی حاصل کیا ۔

۱۹۱۲ کے وسط میں آپ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۱۵ میں بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آکر فلسفہ کا ریکارڈ قائم کیا ۔ (سر) میاں فضل حسین مرحوم ان دنوں اسلامیہ کالج کمیٹی لاہور کے سکریٹری اور خواجہ جمال الدین بی ۔ اے انسپکٹر مدارس کشمیر تھے ۔ اول الذکر نے آپ کو کالج میں پروفیسر کا عہدہ پیش کیا اور موخرالذکر نے کہا کہ شیخ مقبول حسین صاحب ریونیو منسٹر کشمیر آپ کو اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بنانا چاہتے ہیں مگر آپ نے علمی زندگی کو ترجیح دی اور دوسرا عہدہ قبول نہ کیا ۔

انہی دنوں گلمرگ میں عید کا چاند دیکھ کر آپ نے " ہلال عید " ایک نظم لکھی جو روزنامہ زمیندار میں چھپی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس وقت چھندواڑہ میں نظر بند تھے۔ نظم دیکھ کر پھڑک اٹھے اور یہ شعر توورد زبان کر لیا :

دل کی جمعیت سے لطف ساز بھی اور سوز بھی
آبرو ملت کی ہو تو عید بھی نوروز بھی

بی ۔ اے میں اول آنے پر تعلیمی وظیفہ کے علاوہ مہاراجہ قاسم بازار کا تمغا بھی ملا ۔ ۱۹۱۷ میں ایم ۔ اے پاس کیا اور یونی ورسٹی بھر میں اول آئے ۔ اسی سال لاہور کے لاء کالج میں داخل ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ خواجہ احد شاہ کے انگریزی اخبار '' پنجاب آبزرور '' کی ادارت بھی کرتے رہے ۔ اس اخبار کی بے لاگ تنقیدوں سے متاثر ہوکر حکومت کے محکمۂ احتساب نے سرمائیکل اوڈوائر کے اشارہ پر اس اخبار کی ضمانت ضبط کرلی ۔

وکالت کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے آپ کو فلسفہ کی پروفیسری پیش کی ۔ چنانچہ ۱۹۱۹ میں آپ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے ۔ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں نے آپکی خدمات سے خوش ہوکر آپ کو ولایت جانے کا ارشاد فرمایا ۔ ۱۹۲۲ میں آپ اپنے چھوٹے بھائی عبدالغنی ، اپنی اہلیہ اور خورد سال بچہ عارف اور اپنے بہنوئی ڈاکٹر عطاءاللہ بٹ ایم بی ایس ۔ ایم ۔ ڈی (برلن) کے ہمراہ یورپ روانہ ہوئے ۔ وہاں تین سال رہے ۔ جرمنی اور انگلستان کی نامور یونیورسٹیوں فزائی برگ، ہائیڈل برگ اور کیمبرج میں آپ نے فلسفہ کی تکمیل کی اور ۱۹۲۵ میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لے کر واپس آئے ۔

۱۹۲۳ میں جب سر امر سنگھ ڈگری کالج سرینگر کے پرنسپل کی آسامی خالی ہوئی تو حکومت کشمیر نے حضور نظام سے آپ کی خدمات مستعار لے کر آپ کو موقعہ دیا کہ آپ اپنے آبائی وطن کی تعلیمی خدمات انجام دیں ۔ اس کے بعد آپ ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیمات جموں و کشمیر کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے ۔

کشمیر میں آپ درجۂ اول کے اسٹیٹ سبجکٹ بھی قرار دئے گئے اور زمیندار بھی ۔ آبائی زمینداری تو آپ کے دادا رمضان ڈار (وفات ۱۸۸۱) کے دیگر اقارب کے پاس رہی لیکن آپ نے نسیم باغ میں ذاتی جائداد پیدا کر کے باغ کے کنارے ایک بنگلہ تعمیر کرایا تاکہ باقی ماندہ زندگی کے لئے اسی مقام کو مستقر بنائیں ۔ یہ وہی نسیم باغ ہے جس کے متعلق جسٹس میاں محمد شاہدین مرحوم نے یہ شعر کہا ہے :

جی چاہتا ہے ہو مرا مسکن نسیم باغ مر جائیے تو ڈل کے کنارے مزار ہو

مگر ۱۹۴۷ میں ملک تقسیم ہوگیا اور آپ کو وہاں رہنا نصیب نہ ہو سکا ۔ سب کچھ وہیں چھوڑ کر با دل ناخواستہ لاہور آنا پڑا ۔

آپ انگریزی اور اردو کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ۔ آپ کا فلسفیانہ اردو کلام بھی ملک میں بے حد مقبول رہا ہے ۔ اردو نظم میں گیتا کا ترجمہ بھی کیا ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہوکر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے ۔

چند نظمیں نمونے کے طور پر یہاں پیش کی جاتی ہیں ۔ ان سے آپ کے تخیل کی بلندی اور قادرالکلامی کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے گا ۔ ابتدا میں آپ اپنا کلام

اقبال کو دکھاتے اور ان سے مشورہ لیتے تھے۔

زمانہ طالب علمی کی ایک غزل دیکھئے جس پر اقبال نے لکھا :"برخوردار! تخیل کو بے عنان ہونے سے بچانا چاہئے"۔ دیکھئے کس مشکل زمین میں کیا کیا گلریزیاں کی ہیں :

سب برگ و بار سبز ہیں اور شاخسار سبز
یعنی کہ نغمہ سبز ہے اور ساز و تار سبز

مانند سایہ نقش قدم کے نشان ہیں
جادہ کے خط کو دیکھ سر راہ گذار سبز

ہر چیز زیب تن ہے کئے حلہ بہشت
میدان و کوہسار یمین و یسار سبز

ہر نخل سبز، سبز زمین پر ہے جھومتا
گویا ہے اسپ سبزہ کے اوپر سوار سبز

ممکن ہے پڑگئی ہو تن مردہ میں بھی جان
جوش نمو میں ہے رگ سنگ مزار سبز

سبزے سے ہے جو خاک کا عنصر بدل گیا
ہے توسن نسیم سے اٹھتا غبار سبز

اس میں ہے حسن شاہد قدرت چھپا ہوا
گویا کہ ہے نقاب رخ پردہ دار سبز

دنیا کا ذرہ ذرہ شہیدوں کی خاک ہے
شاید قبا انہیں کی ہے یہ یادگار سبز

جس جا پہ دخل آب ہے سبزہ کی ہے نمود
کیونکر ہر ایک شعر نہ ہو آبدار سبز

خامہ تھا چوب خشک جو محو بیان ہوا
ذکر بہار سے ہوا پھر ایک بار سبز

(۲)

وہی دیدہ ور اور اہل نظر ہے جو پتھر کے اندر شرر دیکھتا ہے
ملے ہیں جو مٹی میں ناچیز دانے وہ ان میں شجر اور ثمر دیکھتا ہے
تو پھولوں میں بس رنگ و بو ہی کا طالب وہ کلیوں کا زخم جگر دیکھتا ہے
اشارے سمجھتا ہے ہر برگ گل کے رموز آشنا کچھ ادھر دیکھتا ہے
نگاہوں کو جس تک نہیں ہے رسائی وہ ہر شے میں اس کا اثر دیکھتا ہے
تجھے چشم بے نم سے دکھتا نہیں ہے وہ جو حسن با چشم تر دیکھتا ہے
سمجھتا ہے تو جس کو شبنم کا قطرہ وہ اس میں ضیائے گہر دیکھتا ہے

ہنر میں بھی کرتا ہے تو عیب چینی
وہ عیبوں کے اندر ہنر دیکھتا ہے

(۳)

اس نظم کو اقبال نے بہت پسند کیا اور جب آغا حشر کاشمیری تک اس کی گونج پہنچی تو آپ نے خلیفہ صاحب سے فرمایا : '' یہ اشعار میرے دماغ میں گونجتے رہتے ہیں ۔ میں نے ایک دفعہ اس زمین میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ اس پایہ کے اشعار نہ نکل سکے۔ اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا داد دوں ؟''

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر   بارش تیر حوادث میں جگر پیدا کر
گرم رو ہو کہ جہاں نقش قدم ہو تیرا   اس کف خاک میں بھی برق کے پر پیدا کر
تو اگر چاہے کہ گم ہو شب تاریک تری   سینۂ چاک بہ انداز سحر پیدا کر
قطرہ آغوش تلاطم میں گہر بنتا ہے   آبرو چاہے تو طوفان میں گہر پیدا کر
خواہش تیغ کو ہے قوت بازو کی بھی شرط   آرزو تاج کی ہے تجھ کو تو سر پیدا کر

تیغ ہستی کے لئے سنگ فساں ہے بیکار
راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

زندگی اور وقت

طرز زیست سے اس کو ماپ   اس کو نہ ماہ وسال سے گن
خضر کی عمر سے ہے بہتر   ہمت و خوبی کا اک دن
کانٹے کی ہے عمر دراز   پھول حسین ہے پر کم سن
صدی پہ بھاری اک ساعت   یہ اعجاز بھی ہے ممکن
دل تخلیق سے ہے زندہ   کام ہے ہستی کا ضامن
وقت ہے دولت بیش بہا   انسان ہے اس کا خازن
کرے حفاظت تو ہے امیں   اور گنواوے تو خائن
جینا ان کا جینا ہے   جو انسان کے ہیں محسن
وقت کا دشمن ہے کافر   وقت کا عاشق ہے مومن

جس کا وقت ابد پیوند
کہتے ہیں اس کو مومن